R. No. 2186/57
Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون — ۴۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

تاریخ اشاعت

جلد ۲۳ - شمارہ ۴۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم دسمبر ۱۹۶۴ء

اداریہ

سیاسی پارٹیوں سے اپیل

ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں میں سب سے اہم کانگریس ہے۔ سترہ برس سے یہ آزاد ہندوستان کی حکومت چلا رہی ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں اس جماعت نے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کی قیادت میں سب سے نمایاں حصہ لیا۔ اس پر ملک کے حالات کی ذمے داری بھی سب سے زیادہ ہے۔ آج ہم نے جو ترقی کی ہے اس کا سہرا بھی اس کے سر ہے اور ہم میں جو خامیاں راہ پا گئی ہیں، ان کی ذمے داری سے بھی یہ سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اس لیے سیاسی پارٹیوں سے خطاب کرتے وقت سب سے پہلے ہمیں کانگریس سے کچھ کہنا ہے۔ کانگریس نے اردو کے سلسلے میں اپنی پوزیشن خاصی واضح کر دی۔ یہ پارٹی تمام قومی زبانوں کا فروغ چاہتی ہے۔ یہ لسانی اقلیتوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا چاہتی ہے۔ یہ مادری زبان میں تعلیم کے اصول کو مانتی ہے۔ اس کی مجلس عاملہ اردو کے سلسلے میں اور لسانی اقلیتوں کے سلسلے میں اپنی پالیسی کا کئی دفعہ اعلان کر چکی ہے۔ اس کی مرکزی حکومت کا رویہ اردو کے متعلق ہمدردی کا رہا ہے اور مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو نے تو اردو کی حمایت میں درجنوں تقریریں کیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو بھی اردو کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اس ہمدردی کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ اردو کے ساتھ کوئی بے جا رعایت کی جائے۔ ہم نے زبان کے سلسلے میں جو قومی پالیسی بنائی ہے اس کے اندر اردو کے ساتھ انصاف کی پوری گنجایش ہے۔ پھر یہ بات دریافت طلب ہے کہ ریاستی حکومتیں مرکز کی پالیسی پر جو ایک سیاسی جماعت کی بنائی ہوئی ہے کیوں عمل نہیں کرتیں۔ کیا کانگریس اس بات پر خاموش رہے گی کہ اس کی بنائی ہوئی ریاستی حکومتیں اردو کے سلسلے میں من مانی کرتی رہیں۔ کیا اس سے قول اور عمل کا تضاد ظاہر نہیں ہوتا۔ کیا اس سے ایک اخلاقی کمزوری ظاہر نہیں ہوتی۔ کیا اس سے قومی سیرت کی تشکیل میں، قومی یک جہتی کے عام ہونے میں، ایک مضبوط اور متحد اور طاقت ور قوم کے بننے میں دیر نہیں لگتی۔ کیا اس سے ہماری جمہوری اور سیکولر بنیادوں کو صدمہ نہیں پہنچا۔

پھر کانگریس کے علاوہ ملک میں سوشلسٹ، کمیونسٹ، سوتنتر اور جن سنگھ کی بھی اہمیت ہے۔ یہ سب پارٹیاں اپنے اپنے طور پر ملک کی خدمت کا دعوا کرتی ہیں اور ان سب کا ملک میں اثر ہے۔ ان میں سے ہر پارٹی نے کسی نہ کسی موقع پر اردو کے ساتھ ہمدردی کا اعلان کیا ہے۔ جن سنگھ کا رویہ کچھ عرصے پہلے تک اس سلسلے میں واضح نہ تھا لیکن اتر پردیش جن سنگھ کے جنرل سکریٹری نے گذشتہ سال اردو کے سلسلے میں اپنی پارٹی کی پوزیشن واضح کی تھی اور اردو کے حقوق کے ساتھ انصاف کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

پھر یہ کیا بات ہے کہ اتر پردیش، بہار، دہلی اور پنجاب میں اردو کو بھی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے سے ہندی کی فضیلت کیسے کم ہوگی۔ ہندی کی فضیلت مسلم ہے۔ وہ راشٹر بھاشا ہے اور بعض ریاستوں کی سرکاری زبان ہے۔ اب اگر بعض ریاستوں میں اردو کو بھی ایک

اس شمارے میں

خاص درجہ حاصل ہے اور اس کی وجہ سے اردو کو بھی سرکاری زبان بنایا جاتا ہے تو اس سے ہندی کو کیا خطرہ ہوتا ہے اور کچھ ہندی کے دوست اس سے کیوں چڑتے ہیں۔ انجمن ایک عرصے سے اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ اترپردیش، بہار، دہلی اور پنجاب میں اردو کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ کیا کوئی ایماندار آدمی اس روشن اور بدیہی حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ ان علاقوں میں صدیوں سے اردو کا چلن رہا ہے اور آج بھی ہے اور ان علاقوں کی جو بھی خصوصیت ہے اس میں اردو کا چلن شامل ہے اور اس چلن اور روایت کو علیحدہ کر کے ان علاقوں کی خصوصیت اور مزاج کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جب سب سیاسی پارٹیاں اس قومی سوال پر متفق ہیں تو اس کو عملی شکل دینے میں پس و پیش کیوں ہے اور اس میں ٹال مٹول سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

آج ہر سیاسی پارٹی کا فرض ہے کہ وہ چند قومی مسئلوں پر دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرے۔ ملک کے بچاؤ، اس کی ترقی اور خوش حالی، قومی یک جہتی، قومی تسلیم کے مسئلے اب پارٹیوں میں اختلافات کے مسئلے نہیں رہے۔ ان کے جزئیات پر گفتگو ہو سکتی ہے، مگر ان کے سلسلے میں سب پارٹیوں کے اشتراک کے ساتھ جلد سے جلد قدم بڑھانا چاہیے اور قول اور عمل کی خلیج کو پاٹ دینا چاہیے۔ ملک کی مضبوطی کے لئے یہ سب سے بڑا قدم ہوگا۔ اردو کا مسئلہ بھی ایک ایسا ہی قومی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو صرف حکومت کا یا صرف اردو دوستوں کا مسئلہ سمجھنا غلط ہوگا۔ یہ ہر محبِ وطن کا مسئلہ ہے اور ہر اس سیاسی پارٹی کی توجہ کا مستحق ہے جو ملک کے مفاد کو لے کر میدان میں آئی ہے اور اقتدار حاصل کرنے کی خواہاں ہے۔ دیکھنا ہے یہ احساس کب عام ہوتا ہے اور کب عملی روپ اختیار کرتا ہے۔

بھوپال میں مشاعرہ

بھوپال۔ ۲۴ر نومبر۔ انجمن فروغ ادب (ہیوی الیکٹریکلس) کی جانب سے نہرو جینتی کے موقع پر ٹریننگ اسکول کے وسیع اور خوبصورت اسمبلی ہال میں کوثر چاندپوری کی صدارت میں ایک بزم مشاعرہ منعقد کی گئی۔ مشاعرہ سکریٹری کے فرائض عشرت قادری نے انجام دیئے۔ یہ مشاعرہ ایک بجے رات کو ختم ہوا۔ مشاعرہ کا افتتاح ہیوی الیکٹریکلس کے جنرل منیجر شری آر۔ سو بیا نے کیا۔

اس مشاعرے کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ذیل کے مصرعِ طرح پر پانچ منٹ میں فی البدیہہ تعزیتی نظم یا اشعار کہنا تھے۔

"بوئے گل سو گئی، سوزِ فن مرگیا"

کچھ اشعار قارئین کی دلچسپی کے لیے درج ہیں:۔

مرثیہ گو ہیں کیوں آج اہلِ سخن
اے غزل کیا ترا بانکپن مرگیا
(گوہر جلالی)

کچھ خبر بھی ہے تجھ کو وفا ناشناس
شہر میں اک غریب الوطن مرگیا
رونقِ بزم تو ہے وہی دوستو!
کون کہتا ہے اربابِ فن مرگیا
(عشرت قادری)

کیا غضب ہوگیا فکر کی آنچ سے
زندگی چیخ اٹھی اہلِ فن مرگیا
(وحید پرواز)

روٹھ جانے کے بعد لئے جواہر تھے
جیسے سارا کا سارا چمن مرگیا
(شفق بھوپالی)

جس سے تھی تیشۂ کوہکن کی آبرو
لوگ کہتے ہیں وہ کوہکن مرگیا
(رفعت الحسینی)

دل اگر مرگیا بانکپن مرگیا
آنکھ بھیگی اگر سوزِ فن مرگیا
(فضل تابش)

جس سے تھی عظمت علم و فن دوستو!
ہائے وہ رونقِ انجمن مرگیا
(وفا صدیقی)

زندگی کا حسیں بانکپن مرگیا
ساتھ نہرو کے سارا چمن مرگیا
(شاد سلطانپوری)

نو شگفتہ گلوں پر خزاں چھا گئی
دوستو! آج جانِ چمن مرگیا
(مسلم ساگری)

عام جشنِ چراغاں کی کردو خبر
شہر میں آج اک کشتۂ تن مرگیا
(انصار نظر)

یاد اس کی رلائے گی اب حشر تک
ہائے کیوں، رونقِ انجمن مرگیا
(مقبول گوالیاری)

(رضی مجیدی سکریٹری انجمن فروغ ادب ہیوی الیکٹریکلس بھوپال)

غالب کے یوم پیدائش کی تقریب کا افتتاح وزیر اعظم لال بہادر شاستری کریں گے

لکھنؤ ۱۹ر نومبر۔ توقع کی جاتی ہے کہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری ۲۵ر دسمبر کو وارانسی میں غالب کے یوم پیدائش کی تقریب کا افتتاح کریں گے۔ اس سلسلے میں غالب اکیڈمی نے ایک ہفتہ کا پروگرام تیار کیا ہے۔ مرزا غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تمحیص ہوگی اور ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔ توقع ہے کہ اس مشاعرے میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور شعرا شرکت کریں گے۔ غالب اکیڈمی کے صدر مولانا خیر بھیروی نے کہا ہے کہ ۲۷ر دسمبر کو ہندوستان بھر میں یوم غالب منایا جائے گا۔

(الجمعیۃ، دہلی)

علی بن ایاز

محمد نادر علی برتر

محمد نادر علی برتر ایک باکمال اور اپنے وقت کے یگانۂ روزگار میں شمار ہوتے تھے۔ موصوف کا زاد بوم اگرچہ غازی پور تھا، مگر جوانی ہی میں حیدرآباد آ گئے اور یہیں کی خاک میں آسودہ ہیں۔

آپ ۱۸۶۵ء میں غازی پور میں محمد بخت علی مرحوم کے گھر پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش اور تعلیم پائی اور علوم متداولہ سے ۱۸ سال کی عمر میں فراغت پا کر بتلاش روزگار رام پور پہنچے جہاں غالب کے بھتیجے رابط نے انھیں ذہین اور ہونہار پا کر اپنی شاگردی میں لے لیا محمد بخت علی کی وفات کے بعد ان کے چچا ماجد علی رام پور پہنچے اور انھیں وطن لا کر شادی کر دی۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے استاد کے ساتھ بڑودہ اور بھنڈ، گیا، بہار وغیرہ کا سفر کرتے رہے۔ ان ریاستوں کے رئیسوں نے رابط کے ساتھ انھیں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا، اور قدردانی کی۔ استاد کے انتقال کے بعد دہلی میں ایک عرصہ تک رہے اور لکھنؤ ایک مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے پہنچے۔ اس زمانہ میں لکھنؤ میں استاد ظہیر جانشین ذوق کا طوطی بول رہا تھا۔ برتر نے ان کی شاگردی اختیار کر لی اور تا دم آخر ان کا ساتھ نہ چھوڑا

حیدرآباد میں ورود

اجمیر ایک مشاعرہ کی غرض سے جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت شمس الدین فیض سے ملاقات ہوگئی۔ برتر حضرت شمس کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور آپ کے ساتھ حیدرآباد آ گئے۔

جس روز آپ وارد حیدرآباد ہوئے حسن اتفاق سے اسی شام نامپلی میں حضرت داغ کی صدارت میں مشاعرہ تھا۔ آپ بھی ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے مصرع طرح پر ایک غزل لکھ ڈالی۔ سب کے بعد جب داغ صاحب پڑھنے پر آمادہ ہوئے تو آپ نے اپنی غزل سنانے کی اجازت چاہی لوگوں نے وقت کا عذر کیا مگر داغ صاحب نے اجازت دیدی۔ آپ نے غزل سے پہلے یہ رباعی پڑھی۔

ہوں سب کو عزیز زندگانی کی طرح — خوش وقت ہوں عہد نوجوانی کی طرح
میں بھی ہوں وہ جوہر لطیف اے برتر — ہر رنگ میں مل جاتا ہوں پانی کی طرح

رباعی اور غزل سن کر نوجوان شاعر کو داغ نے دل کھول کر داد دی اور تخلص سن کر فرمایا: "برتر تم ہی ہو۔ میں ہمیشہ سمجھتا تھا کہ برتر کوئی معمر شخص ہوں گے۔ کیوں نہ ہو یادگار رابط ہو۔" کہتے ہیں کہ اسی جلسہ میں راجہ رائے رایاں نے آپ کو اپنے زمرہ ملازمت میں داخل کر لیا۔ دوسری صبح مہاراجہ کشن پرشاد نے نواب سراج الدین خاں سائل کے ذریعہ بلا بھیجا تو آپ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ میں نے مہاراجہ رائے رایان کو زبان دیدی ہے۔ اس تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رائے رایان بہادر حضرت شمس الدین شمس کے معتقدوں سے تھے۔ برتر نے اپنے ایک شعر میں حضرت شمس سے اپنی وابستگی کا یوں ذکر کیا ہے۔

ہم برے سے تھے برے برتر مگر صد شکر ہے — اک نگاہ شمس نے اچھے سے اچھا کر دیا

اولاد

حضرت برتر کے ایک فرزند محمد شاکر علی شاکر اور دو صاحبزادیاں ہوئیں لڑکیاں غازی پور ہی میں بیاہی گئیں۔ شاکر حیدرآباد ہی میں رہ بس گئے اور یہیں انتقال کیا۔ ان کے دو فرزند محمد مشتاق علی مشتاق اور محمد اقبال علی اور ایک صاحبزادی حیدرآباد ہی میں فروکش ہیں۔

دوسری شادی

حیدرآباد آنے کے دو سال بعد برتر کی اہلیہ کا کچھ دنوں بعد انتقال ہوگیا اور دوسری شادی پھر اپنے عزیزوں ہی میں کی۔ مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ بیوی بھی اپنے شوہر سے پانچ سال قبل وفات پا گئیں۔

نواب فخر الملک سے وابستگی

مہاراجہ رائے رایان کے انتقال کے بعد نواب فخر الملک نے انھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ اور یہ ان کے وابستگان میں شامل ہو گئے۔ مہاراجہ سر کشن نے پھر بلایا مگر پھر آپ نے معذرت کر لی، اور تا دم آخر نواب صاحب کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔

سکونت اور وفات

ابتداً جب آپ حیدرآباد آئے تو نارائن گوڑہ میں فروکش ہوئے لیکن مہاراجہ رائے رایان کی وفات اور نواب فخر الملک سے وابستگی کے بعد سدی رسالہ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا اور سدی رسالہ کے قبرستان ہی میں دفن ہوئے۔

علمی مشاغل

حضرت برتر صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ آپ کا اشہب خامہ جس طرح میدان نظم میں جولانیاں دکھاتا تھا، اسی طرح نثر کے میدان میں طرارے بھرتا تھا۔ سخن کی کوئی صنف ایسی نہ تھی کہ جس میں آپ نے اپنی ذہنی جودت کو نہیں آزمایا۔ آپ کی ادارت میں ماہنامہ نسیم دکن ایک عرصہ تک نکلتا رہا دوسرے ماہناموں میں بھی آپ کے رشحات قلم نظم و نثر کی صورت میں جلوہ گری کرتے رہے۔ ایک ناول عابدہ بھی آپ کی یادگار ہے جس میں آپ نے اپنے عہد کے تہذیب و تمدن کی عکاسی کی ہے۔ یہ ناول اتنا مقبول ہوا کہ ایک سال کے اندر اس کا دوسرا اڈیشن نکلا

حضرت برتر کی نشو و نما ایک ایسے دور میں ہوئی جسے شاعری کا عروج اور سیاسی زوال کا دور کہنا چاہیے۔ معاشی انتشار کی بدولت انھیں وطن چھوڑ کر ریاست ریاست کی سرپرستی قبول کرنی پڑی، جہاں فن شعر میں ہر قسم کے اہل کمال موجود تھے جن سے ہر وقت

مقابلے رہتے تھے اور اپنے مقام پر برقرار رہنے کے لیے اپنے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی ہر وقت جد و جہد کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اسی جد و جہد نے ان کی فطری صلاحیتوں کو جلا دی اور ان کو استادی کے درجہ تک پہنچا دیا۔

تلمذ اور رنگ سخن

ابتداً حضرت برتر کو رابطہ کی شاگردی نصیب ہوئی جو غالب کی یادگار تھے چنانچہ ان کی معیت اور شاگردی نے ان کی طبیعت میں غالب کے رنگ کو بڑی حد تک رچا دیا۔ اس زمانے کا کلام اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن جب لکھنؤ میں ظہیر کی شاگردی اختیار کی تو ظاہر ہے کہ استاد کا رنگ اختیار کرنا پڑا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگ ان کے فطری میلان کے مطابق نہ تھا اور ان کی طبیعت پر غالب نہ آسکا۔ کلام سے مترشح ہے کہ مومن کا رنگ ان کے میلان طبع کے موافق تھا جو غالب رہا۔ پھر ان کی جولانی طبع اور مشق و مزاولت نے اپنا رنگ الگ پیدا کر لیا جس کی مثالیں ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ غالب کے رنگ میں

دیکھ کر رحمت کو تری لغزشِ مستانہ بجنگ　　حشر کے بازار میں کیا نرخ عصیاں بڑھ گیا

مجھ سے وحشی کی نگہبانی کا ہو رہینہ بست　　حلقۂ در حلقۂ چشم سلاسل ہو گیا

کیوں تحیر گاہ ہے بزمِ خراباتِ جہاں　　یہ بھی کیا آئینہ ہے میرے دل صد چاک کا

دل ایذا طلب غفلت ایجاد ستم　　سختت بیداد جو گر ورد بیداد نہیں
شوق جاں دادگی و شیوۂ الفت تو یہ　　سختی راہ طلب کوشش فرہاد نہیں

شاہد معنی سخن کا ہے برتر مرا سخن　　پہنچا ہے فیض غالب رنگیں نوا مجھے

۱۔ مومن کے رنگ میں

جانے کیا ساقی کی آنکھوں نے اشارہ کر دیا　　مدرسا غر آج ہم نے زہد و تقویٰ کر دیا
دل کو آزار محبت سے مزے آنے لگے　　اس کے میں قربان جس نے درد پیدا کر دیا
کعبہ والوں سے جو پوچھی میں نے منزل یار کی　　بتکدہ کی سمت چپکے سے اشارہ کر دیا

نہ اترا آئینہ میں عکس ناز خوش جمالی کا　　بنا ہو عالم تمثال عالم بے مثالی کا
نہ نیند آئے نہ وہ آئیں نہ نکلے دل کی حسرت　　شب فرقت عدو یہ عالم ہو مری حسرت مآلی کا

مزاج یار کی بے اعتباریاں تو بہ　　خفا تھا غیر سے کل آج مجھ سے برہم ہے

ہے اتفاق قسمت نزاکت کسی کی　　نظر بن گئی ہے مصیبت کسی کی
کوئی جان بھی دے نہ دے کوئی تسکیں　　کسی کا وہ دل یہ طبیعت کسی کی

۳۔ خاص اپنا رنگ

کلک قدرت میں وہ روانی ہے　　نقش اول ہی نقش ثانی ہے
پھر ہے منظور پردہ بیداد　　پھر لباس ان کا آسمانی ہے

محو دید نظارہ کی شکلیں کھا گئی　　وہ شمل ہوش چل دیئے غش آ گئے

آئینہ تھا مدعائے حالت ناگفتہ بہ　　خامشی اپنی حریف ذوق گویائی نہ تھی
دیکھنی تھی بے نیازی حسن والوں کی ہمیں　　ورنہ مجھ کو ایسی تمنائے جبیں سائی نہ تھی
اٹھ کے شور حشر نے برتر عبث چونکا دیا　　نیند آنکھوں میں ابھی اچھی طرح آئی نہ تھی

۴۔ روز مرہ اور محاورے

غرض ہے چارہ گر زخم سے گھٹنے سے رہ آیا　　اگر ناخن کے بھی ٹکڑے رہیں دل میں مرہم ہیں

شمع بزم عدو بنا ہوں میں　　غیر کی آگ میں جلا ہوں میں

جھگڑا پڑا جو بار امانت کے باب میں　　چھانٹے گئے ہیں ہم انتخاب میں

یہ اچھی سیر خود بینی ہوئی کیا سو گیا ہوگا　　تمہارا عکس آئینہ سے تم آپ ہی باہر ہو

تصدق سیکڑوں دل ہوں گر دلدار ہو تم سا　　ہزاروں جان قربان گر تم سا جان جہاں ہو

انجام بدگمانی الفت بھی کیا کہوں　　اغیار پاس پاس ہیں تم دور دور ہو

نزاع صحبت باہم کو لے بر تر سلام اپنا　　خدا رکھے سلامت دور کی صاحب سلامت کو

شمر باری کا شکوہ اور پھر مجھ سوختہ جاں سے　　مری جاں پھول تو جھڑتے نہیں ہیں آتش زباں سے

۵۔ تراکیب

گرم خرام ناز رہیں وہ کوئے غیر میں　　بھڑکا رہا ہے شعلہ آواز پا مجھے

کر دیا عاجز بناں کو ششِ بے سود نے　　بن گئیں ناکامیاں جب تن آسانی مجھے
چشم تر دیتی ہے پیہم لال پیکانی مجھے　　خون رواں ہو گیا کیا ناوک مژگاں کی یاد
آپ آئینہ کو خواہی ہیں جو بیں حسن کی　　پھر نہ لے ڈوبے کسی دن یہ بہ جا ہی مجھے

بہت بھڑکا ہوا ہے شعلہ حسن شباب آتے　　بس چلمن جو بیٹھے ہیں دھواں اٹھتا ہے چلمن سے

۶۔ معاملہ بندی

الٰہی کس طرح پوری ہو بات مطلب کی　　وہ سن کے کہتے ہیں کیا بات ہے جواب نہیں
حیا سے گالیاں دیتے ہیں کھل کے دشمن کو　　کسی کا روئے سخن بھی تو بے حجاب نہیں

جھلک اپنی دکھا کر کس لیے چھپتے ہو چلمن میں　　تمہیں پہچانتے ہیں ہم کہ صورت آشنا تم ہو

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

غزلیں

ثریا محمود ندرت

عدم کی سمت بہت ہو کے بے قرار چلے
متاعِ زیست لٹانے کو جاں نثار چلے

نہ راہ روک سکی کوئی آرزو میری
جھٹک کے دامنِ دل آج سوئے دار چلے

بساطِ دل پہ نہیں ہم کو اس کا غم کوئی
کہ بازیٔ شوق کی ہم جیت کے بھی ہار چلے

وہیں سے فاش ہوا رازِ شوق پہلے پہل
بنا کے اپنا جنھیں ہم جو رازدار چلے

پلٹ کے آ گئے پھر تیری بزمِ رنگیں میں
اگرچہ در سے ترے پھر کے بار بار چلے

ہماری آہ جو پہنچی کبھی سرِ گردوں!
فرشتے لے کے اسے پیشِ کردگار چلے

وہ ہم کہاں رہے لیکن ذرا سی بات پہ ندرت
غمِ حیات کی زلفیں جو ہم سنوار چلے

سحر کاظمی

زندگی آخر کہاں لے آئی ہے
میں ہوں اور اک عالمِ تنہائی ہے

زیست کیا ہے؟ موت کی بے آبرو
موت کیا ہے؟ زیست کی انگڑائی ہے

یادِ ماضی برق بن کر آج پھر
آسمانِ فکر پر لہرائی ہے

ساری دنیا ہو گئی ہے اجنبی
آج مجھ کو یاد کس کی آئی ہے

تو بھی دے اے صبا تارِ سکوت
کیا کوئی پیغام لے کر آئی ہے

جب بھی بہکے ہیں وہ حق بیں قدم
زندگی ہر گام پر شرمائی ہے

کس کے غم نے جگایا ہے مجھے
راہ میں جب اے سحر نیند آئی ہے

شمسی طہرانی

ہر نفس نالۂ مجبور نہ جانے کیوں ہے
دل تری یاد سے رنجور نہ جانے کیوں ہے

ایک دیوانہ کہ ہے بے سر و خاک بسر
آپ کے شہر میں مشہور نہ جانے کیوں ہے

آج شاید کسی موسیٰ پہ گری برقِ جمال
ایک ہلچل سی سرِ طور نہ جانے کیوں ہے

رند کچھ پی کے بہک سے گئے پیاسے ساقی
تیری محفل کا یہ دستور نہ جانے کیوں ہے

کس سے پوچھیں کہ رخِ تیغ کی مجبوری پر
غازۂ قیصر و فغفور نہ جانے کیوں ہے

سامنے دار بھی پھر بھی دلِ حق آگاہ
پیرو مسلکِ منصور نہ جانے کیوں ہے

میکدہ چھوڑ دیا پھر بھی سرِ راہِ حیات
سایۂ ساقیٔ مخمور نہ جانے کیوں ہے

قرب تھا جس کو مری ذات سے کتنا لیکن
آج وہ مجھ سے بہت دور نہ جانے کیوں ہے

ہو گیا ترکِ تعلق کو زمانہ لیکن
دل ترے نام سے مسرور نہ جانے کیوں ہے

غم ہو سو سال تو دو دن ہو مسرت یا رب
تیری رحمت کا یہ دستور نہ جانے کیوں ہے

رخصت اے خندۂ گل گر کہ ترا شمسی زار
عازمِ شہرِ حجاباں پورہ نہ جانے کیوں ہے

افتخار احمد فہمی نادری

لاکھ دانا ہو کوئی بھید نہ جانے دل کے
روٹھ جانے کے لیے سو ہیں بہانے دل کے

اوج پر آ گئی اے دوست جہاں دل کی لگی
ہو گئے دہر میں مشہور فسانے دل کے

الفتِ دہر و وفا عشق و طرب سوز و گداز
کتنے ہم ساز بنائے ہیں خدا نے دل کے

دل سی شے پر بھی کہیں برق گرا دے کوئی
جز اس میں ہے کہ رکھو ہوش ٹھکانے دل کے

صدقِ احساس بھی اک صف بچا ہو اس کا
جا لگے اپنی جگہ ٹھیک نشانے دل کے

یہ بھی سوچا تھا کہ کر دوں ترکِ محبت فہمی
کیا کہوں ہیں کبھی جذبات نہ مانے دل کے

ادیبوں اور دانشوروں کا فورم

کانفرنس برائے امن و بین الاقوامی تعاون نے جس کا اجلاس نئی دہلی میں ۱۴ سے ۱۸ نومبر تک ہوا تھا "مفکروں اور ادیبوں کا بین الاقوامی فورم" منعقد کرنے کے متعلق بعض ہندوستانی ارکان کی تجویز کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ادیبوں اور دانشوروں کی قومی تنظیموں کے صلاح و مشورے سے ایسا فورم منعقد کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔

کانفرنس نے دنیا کے دانشور طبقہ میں پائی جانے والی خیر سگالی اور نیوکلیر جنگ کے خطرے کو روکنے باہمی تعاون و مفاہمت کو فروغ دینے کی فضا پیدا کرنے والے نئے عہد کا باہمی کوششوں کے ذریعے آغاز کرنے کی خواہش کے پیشِ نظر اس بات پر زور دیا ہے کہ موجودہ صورتِ حال اور عالمی کشیدگی میں جو خطرات پوشیدہ ہیں ان کے تعلق سے دنیا کے ضمیر کو بیدار کرنے کی خصوصی ذمہ داری ادیبوں اور دانشوروں پر عائد ہوتی ہے، اور کلچر کے ورثے کے محافظوں کی حیثیت سے ان خطرات کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ان کا فرض ہے۔

(حیات نئی دہلی)

"لیلیٰ مجنوں" کا فارسی مسودہ؟

ماسکو (تاس) سوویت یونین میں امیر خسرو کی نظم "لیلیٰ مجنوں" کا فارسی متن شائع ہوا ہے۔ جو مختلف مسودات کو پیشِ نظر رکھ کر تیار کیا گیا۔ امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵ء) ہفت رنگ ہندوستانی ادب کے ممتاز نمائندے ہیں۔ انھوں نے "لیلیٰ مجنوں" کے زیرِ عنوان ایک طویل نظم ۱۲۹۹ء میں مکمل کی تھی، جو مشرقی ادب کا بہترین شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا کی مختلف لائبریریوں میں اس کے مختلف مسودات پائے جاتے ہیں۔ اصل ابتدائی مسودہ مفقود ہے۔ ان مسودوں میں بعض تضادات و اغلاط ہیں۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر سوویت ماہرین نے اس مسودہ کو پہلی بار مستند طور پر مرتب کیا ہے اس سلسلہ میں انھوں نے قدیم ترین مسودہ کا جو تاشقند میں محفوظ ہے، بھی مطالعہ کیا۔

(صداقت پٹنہ)

حضرت امجد کی ۸۹ ویں سالگرہ

۱۰ رجب ۱۳۸۲ھ م ۱۲ نومبر ۱۹۶۲ء کو امجد اکاڈمی حیدرآباد دکن کے زیرِ اہتمام شہنشاہِ رباعیات حکیم الشعراء حضرت سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کا ۸۹ سالہ یومِ ولادت شایانِ شان طریقہ سے منایا گیا۔ اس یادگار دن کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا حضرت امجد کے مزار واقع درگاہ شاہ خاموش صاحب نامپلی پر چادر گل چڑھائی گئی۔ اور لنگر تقسیم کیا گیا۔ (محمد عمر یوسفی معتمد امجد اکاڈمی)

ناظر انصاری جلگاؤں

ادیب کی ذمہ داری

ہمارے تعلیم یافتہ اور جوان نوجوان سالی حضرات جب مضمون نویسی یا شاعری کا آغاز کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر و بیشتر کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ ان کی نگارشات رسائل و جرائد کی زینت بن جائیں۔ اسی لیے وہ مدیران رسائل و جرائد کو اپنی فنی تخلیقات برائے اشاعت ارسال کرتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں شکریے کے ساتھ واپس آجائیں یا ردی کی نذر کردی جائیں تو انھیں بد دل نہ ہونا چاہیے۔ نئے ادیبوں اور شاعروں میں اکثر فن کاروں کو اسی طرح "شکریے کے ساتھ واپس" سے دوچار ہونا پڑتا ہے ابتدائی دور میں ایسے ہی حوصلہ شکن تجربوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے کئی اسباب و علل ہیں، شاہراہِ ادب کے نئے راہی کے پائے عزم و ثبات میں لغزش نہ آنی چاہیے۔ اور بقول فیض احمد فیض۔

"اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی
توفیق اور استطاعت پر ہے، لیکن کوشش میں مصروف
رہنا ہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی"

اور پھر یہ کہ۔

"یہ کوشش کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو، زندگی یا
فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے"

اس لیے ادبی شاہراہ کے نئے راہی کو اپنے پختہ اصول اور واضح نظریے کا فنکار بننے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہنا چاہیے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہی حقیقت پسندی اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے عمدہ موضوعات اور کارآمد و مفید مواد فراہم کرسکتی ہے اور ایک روز اس پر یہ اطلاق صادق آئے گا کہ

ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد

ادیب کا پیشہ بے سود اور بے تحسین و آفرین نہیں ہے۔ حقیقت میں ہمارا ادیب فکر و فن کے سوتوں سے شعر و ادب کی سرزمین کو لالہ زار اور سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے وہ اپنے خونِ جگر سے گلشن ادب کی آبیاری کرتا ہے۔ وہ اپنے باطنی سوز و گداز سے اپنے ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ اور بقول علامہ اقبال ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

غور کیجیے خونِ جگر کیا چیز ہے جس سے معجزۂ فن کی نمود ہوتی ہے فنکار کا خلوص اس کے قلم کا سوز و گداز اور احساس کے تخلیقی جذبے کا دوسرا نام "خونِ جگر" ہے ایسے ہی ادیب اعلیٰ، معیاری اور صحت مند ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کا ادب گراں قدر اور عظیم ہوتا ہے۔ ایسے معیاری ادب کا مطالعہ انسانی دماغ کے لیے روشنی یا تفریح کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ قاری کے تجربے کو بھی مالا مال کردیتا ہے۔

ایک ادیب کسی واقعہ یا صورتِ حال کا تجزیہ کرسکتا ہے اسے نہایت حسین پیرایۂ بیان میں دلیری اور صداقت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر رقم کرتا ہے اس میں فنکار کی فنی دسترس اور خلوص دونوں کام کرتے ہیں۔

اگر آپ ماضی قریب کا جائزہ لیں اور دورِ حاضرہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک میں کئی عظیم المرتبت ہستیاں ایسی گزر چکی ہیں اور موجود بھی ہیں جو سیاسی مفکر بھی ہیں۔ اور ادب میں انفرادیت کی حامل ہیں۔ یہ لوگ ایسے طرزِ تحریر اور رجحانات کے بانی ہیں جس کی تقلید دوسرے لوگ بھی کررہے ہیں۔ ان کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا راز کیا ہے؟ مخلصانہ فنکاری، بھرپور مقصدیت اور مخلصانہ طرزِ عمل ان کے ہاتھوں میں علم و دانش اور فہم و فراست کی ضیا پاش مشعلیں بلند ہیں۔ ان میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جنھوں نے عالمِ انسانیت میں اپنی فہم و فراست، ذہانت و ذکاوت اور اپنے تدبر کے علم کو بلند و بالا کردیا اور ایک عالم سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ ایسے کتنے ہی خوش گو، خوش فکر شاعر اور ادیب ہیں اور ہو گذرے ہیں جو نہ صرف ادب میں بلکہ سیاست میں بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں جن کے فکر و احساس کی لہروں نے زندگی کی نئی رو دوڑادی ہے۔ ان مفکرین کے ادب نے ملک و قوم کے ذہنی انقلاب میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور بڑی پامردی سے شدائدِ زندگی کا مقابلہ کرتے رہے ہیں ان میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں شیدا، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، مولانا حسرت موہانی مرحوم آنجہانی بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ہمارے محبوب و محترم وزیرِ اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو، یہ سبھی ممتاز اہلِ علم اور عظیم المرتبت ادیب و شاعر ہیں۔

ادیب مدتِ دراز تک کشتِ ادب میں اپنے خونِ جگر سے آبیاری کرتا ہے اس میں توانائی۔ تازگی، شادابی اور رنگینی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح اپنے ادب کی آبرو بڑھاتا ہے اسے عظمت و سربلندی عطا کرتا ہے۔ اس میں ابدی حسن و اثر کے نقوش روشن کرتا ہے، بے شک ایسا ادیب مستحقِ تحسین و آفرین ہے۔ اور حیاتِ جاوداں کا حقدار بھی۔

ادب اپنے دور کی زندگی کے پہلوؤں کا تابناک آئینہ ہوتا ہے وہ معاشرہ اور سماج کی خوشیوں اور ناخوشیوں، مسرتوں اور غموں کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں معاشرے کے خد و خال کو جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

کوئی دور کتنا ہی تیز رفتار ہو یا سست رو، انتشار افزا اور زوال آمادہ ہو یا ترقی پذیر یا خوش حالی اور فارغ البالی کا مرقع ہو ہر ادیب اپنے دور کے حالات و واقعات سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ بعض اپنے مرکز سے ملحق رہتے ہیں، بعض الگ شاہراہ بنا لیتے ہیں، لیکن یہ سب زندگی

کے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی امکانی سعی کرتے ہیں۔ زمانے کے حالات دیکھ کر نئے نئے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کا نظریہ بھی ادب برائے زندگی ہی ہوتا ہے۔ وہ ادب برائے ادب سے گریز کرتے ہیں۔ یہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ادب اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ شاہراہ ترقی پر چلاتا ہے جو ادب زندگی کی قدروں کا ساتھ نہیں دیتا وہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد غیر دلچسپ اور نیم مردہ سا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ادیب کا فرض ہے کہ زندگی اور اس کی قدروں کا ساتھ دے یہی اس کا مثبت رجحان ہے۔

ادبی دور اور زندگی کے فلسفے میں ایک نئے موڑ کی نشان دہی اس وقت ہوتی ہے جب ادیب انسانی فتح مندی اور انسانی قدروں میں اپنے اعتماد کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح ادیب کا یہ جوہر اسے قبول عام کی سند عطا کرتا ہے اور وہ اپنی شخصیت، فن اور نظریے کو بخوبی اجاگر کر سکتا ہے

معاشی بدحالی کے زمانے میں ادیب اپنی قوم کی ہمت کو پست ہونے نہیں دیتا۔ فطرت کی رعنائیاں اس زمانے میں بھی موجود ہوتی ہیں لیکن خالی پیٹ رہ کر انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ عشق و محبت سے بھی گریز کرتا ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

چونکہ ادیب کو انسانیت سے نہایت گہرا تعلق خاطر ہوتا ہے اسے عوام سے گہری ہمدردی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی اذیت سے خود بھی دکھ اور اذیت محسوس کرتا ہے۔ حساس ادیب کے افکار عالیہ گویا پوری انسانیت کی روح کی پکار ہوتے ہیں اس طرح وہ اپنے نوک قلم سے اپنے دور کے تہذیب و تمدن، نقش و نگار اور معاشرے کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی معاشی نظریے کی عکاسی بھی۔

ادیب بہرحال سماج اور معاشرے کا ایک ممتاز جز ہوتا ہے۔ وہ بھی انسانی حاجات اور ضروریات کا حامل ہوتا ہے جن کی تکمیل لازمی ہوتی ہے۔ اس کے لیے بھی ذہنی فراغت اور دماغی سکون اسی قدر لازمی ہے جس قدر زندگی کے دوسرے وسائل کی اہمیت ہے اس کے باوجود ادبی تخلیقات میں اس کی شخصیت، انفرادیت اور اہلیت کو کافی دخل ہے۔ انسانیت کے رشتے سے ہر ادیب کا فرض ہے کہ وہ انسان دوست ہو اور وہ اکثر و بیشتر انسان دوست ہی ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو ارتقا کی جانب لے جانے کا نہ صرف متمنی ہوتا ہے بلکہ ایسا ادب پیش کرتا ہے جو زندگی کو اعلیٰ قدروں کی جانب لے جاتا ہے۔ بعض ادیبوں کے علیحدہ علیحدہ نظریے اور معتقدات بھی ہوتے ہیں۔ اور وہ فنی تخلیقات میں اپنے نظریوں اور معتقدات کو کسی نہ کسی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں اشتراکی یا ترقی پسند ادیب، اسلام پسند ادیب، نفسیاتی ادیب، تعمیر پسند ادیب، اور نہ جانے کتنی قسم کے ادیب پیدا ہو گئے ہیں۔ ہر مکتبۂ فکر و خیال کا

نظام فکر ترقی کی جانب مائل رہتا ہے۔ ہمیں ان تمام نظریات کی تفصیلات اور جزئیات سے بحث نہیں ہے۔

آپ کا ادب عوامی زندگی کا ترجمان ہو، عوام کے جذبات کی نمائندگی کر رہا ہو اس میں عوامی مسائل پر بحث کی گئی ہو، امن و سکون اور صلح و آشتی کا پیغامبر ہو یا آپ کا ادب فاتح ادب ہو، اسلام پسند ہو، تعمیر انسانیت کا حامل ہو خواہ کچھ بھی ہو لیکن اگر اپنے نظریے کی تبلیغ کرتے وقت آپ کی تخلیق میں فن کا خلوص شامل نہ ہو آپ زندگی کی نئی قدروں کو بطرز احسن پیش نہ کر رہے ہوں۔ آپ اخلاص مندانہ طور پر بین الاقوامی انسانی برادری کے لیے کوئی تعمیری پیغام نہ دے رہے ہوں تو آپ کا ادب زندگی کو آگے بڑھانے سے قاصر رہے گا۔ اگر آپ نے جرأت مندانہ طور پر امن و آشتی اور انسانی فلاح و بہبود کا نظریہ پیش نہ کیا ہو تو وقتی طور پر داد حاصل کر لینے کے سوا آپ کے ادب کو حیات جاوداں نہ مل سکے گی۔

قابل ستائش ہیں وہ ادیب جو اعلیٰ فنی تخلیق کی صلاحیتیں رکھتے ہیں اور اپنے زاویۂ فکر و بیان سے اپنے ادب کو زیادہ دلکش و مفید بناتے ہیں۔ جو اپنے علم و دانش کے لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہیں جن کی عظیم انفرادیت اپنے ہمعصروں میں سر بلند و باوقار بنا رہی ہے۔ جن کی خوش نما ادبی صناعی، حسین موشگافی اور دلچسپ تنوع بہت اہم ہوتے ہیں۔

ادیب کا فرض ہے کہ وہ مختلف فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان محبت و یگانگت کے جذبات پیدا کرنے کی امکانی سعی کرے۔ ایسا ادب تخلیق کرے جو انسانوں کے دلوں سے تعصب اور فرقہ پرستی کی بیخ کنی کر دے۔ تعصبات کی بنیاد رنگ و نسل میں امتیازات کے باعث ہوتی ہے۔ اسلام کو اس اولیت کا شرف حاصل ہے کہ اس نے رنگ و نسل کے امتیازات کی نفی کی ہے۔ اور دنیا بھر میں پیدا ہونے والے انسانوں کو حضرت آدم کی نسل قرار دیا ہے۔ خواہ وہ انسان کسی بھی خطۂ زمین پر پیدا ہوا ہو، کسی بھی رنگ و نسل کا ہو۔ وہ عالمگیر انسانی برادری کا ایک فرد ہے اسی نظریے کو اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے ؎

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا

ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

ادیب کا یہ فرض ہے کہ مادر وطن سے گہری محبت رکھے۔ اپنے وطن اور ملک کی ترقی اور اس کی عظمت کو تابناک بنانے کے لیے اپنے افکار اور کردار کو وقف کر دے نہ صرف اپنے وطن اور ملک کے امن کی پاسبانی کرے بلکہ عالمگیر امن میں بھی حصہ گیر ہو۔ بین الاقوامی انسانی حقوق پر نہ صرف ایمان رکھے بلکہ ان کے تحفظ میں کوشاں رہے

ادیبوں کو فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر بھی بہ مصداق ؎

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے

اپنی حکومت اور وطن سے گہری وفاداری کا عملاً اظہار کرنا

چاہیے اور اپنے تخلیقی رویہ کو صحت مند بنانے کے لیے حب وطن کے ساتھ ہی ماضی کی عظیم روایات کو بھی مدنظر رکھیں اپنے معاشرے کی فلاح وبہبود اور اس کے ارتقا کی کوشش کریں۔ ماضی کی عظیم روایات جو ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہیں۔ محض فخر و ناز سے کام نہیں چلتا بلکہ ان کے تحفظ وبقا پر ہمیں اپنا خون جگر صرف کرنا چاہیے۔ ان عظیم روایات کو مزید تابناک بنانے کے لیے اپنے افکار وخیالات کو وقف کر دینا چاہیے۔ علامہ اقبال نے عام انسانوں، شاعروں اور ادیبوں کے لیے ان دو اشعار میں نہایت بیش قیمت درس دیا ہے، ادیبوں کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے ؎

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر — شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ہر ادیب کو ان نظریات کا علمبردار ہونا چاہیے جن میں مادر وطن کی روح شامل ہو جو حب وطن کی قدروں کی نشو ونما کرتے ہوں ؎

حب وطن از ملک سلیمان خوش تر

لیکن ان نظریات کے ساتھ مذہب کو فراموش نہ کرنا چاہیے ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اور دوقی کی زبان میں

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

یہی چیز قومی یکجہتی کو مضبوط و مستحکم بنا سکتی ہے۔

انگریزی روزنامہ پانیر کی سوویں سالگرہ

شمالی ہندوستان کے سب سے پرانے۔ انگریزی روزنامہ "پانیر" کی سوویں سالگرہ کی تقریبات کا آغاز ۲۰ نومبر کو لکھنؤ میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ہاتھوں ہوا۔ وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے بھی ان تقریبات میں شرکت کی۔

"پانیر" کا پہلا پرچہ یکم جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کو الہ آباد سے شایع ہوا تھا۔ اس وقت سے یہ روزنامہ پابندی سے شایع ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۲ء تک اس کا عملہ اور مالک انگریز تھے۔ ۱۹۳۳ء میں اس کو الہ آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ (ہندوستان ٹائمز)

"رفتار سیاست" حیدرآباد

اب یہ ہفت روزہ نئے انتظامات کے بعد کہنہ مشق صحیفہ نگار وادیب جناب انور ادیب کی ادارت میں پابندی کے ساتھ ہر دوشنبہ کو شایع ہوتا ہے۔

مضامین خبریں اور منظومات مندرجہ پتہ پر روانہ کیے جا سکتے ہیں۔

منیجر "رفتار سیاست" دبگلی حیدرآباد ۲۳ (آندھرا پردیش)

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان کی علالت

کل ہند اردو کانفرنس جے پور اور اس کے بعد کل راجستھان اردو سمپوزیم جودھپور میں برابر مصروفیات کے باعث سمپوزیم ختم ہونے کے ساتھ ہی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان سخت علیل ہو گئے اب تک صاحب فراش ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبدالقیوم خاں صاحب بڑی توجہ سے معالجہ فرما رہے ہیں۔

چونکہ بہت سے جواب طلب خطوط آئے ہوئے ہیں اور بہت سے معلوماتی۔ اس لیے ان کے جواب جنرل سکریٹری صاحب کی صحت پر ہی تحقیقی طور پر دیے جائیں گے۔ کیونکہ اسسٹنٹ سکریٹری بھی باہر ہیں۔ البتہ یہ یقینی طور پر بتایا جا رہا ہے کہ ریاست راجستھان سے متعلق جس قدر تجاویز منظور کردہ کل ہند اردو کانفرنس تھیں وہ سب متعلقہ حکام اور حکومتوں کو بھیجی جا چکی ہیں۔ (نامہ نگار)

اردو پڑھنے کے خواہشمند طلبا کو تمام سہولتیں دی جائیں گی
وزیر اعلیٰ راجستھان کی یقین دہانی

کوٹہ، ۲۰ نومبر۔ راجستھان کے وزیر اعلیٰ مسٹر موہن لال سکھاڑیا نے یقین دلایا ہے کہ اردو کو صوبہ کے تعلیمی اداروں میں اس کا جائز مقام دیا جائے گا۔ انھوں نے منگل کے دن راجستھان جمعیت علماء کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان طلباء کو جو اردو پڑھنا چاہتے ہیں تمام سہولتیں دی جائیں گی۔ وزیر اعلیٰ نے مشورہ دیا کہ وہ سے ہندوستان کی تعمیر میں مدد دیں اور فرقہ وارانہ سیاست ترک کر دیں کانفرنس نے جس کا افتتاح مرکز کے نائب وزیر زراعت مسٹر شاہنواز خاں نے کیا تھا مطالبہ کیا ہے کہ اردو پڑھنے کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور سرحدی علاقوں کے مسلمانوں کی دشواریاں دور کی جائیں۔ (سیاست جدید کانپور)

اردو ٹائپ اور مختصر نویسی کی تربیت

لاہور، ۲۲ نومبر۔ مغربی پاکستان یوتھ موومنٹ لاہور نے نوجوانوں کے لیے اردو ٹائپ اور مختصر نویسی کی کلاسوں کا اجرا کیا ہے اس کلاس کی کوئی فیس نہیں ہے۔

اردو چونکہ قومی زبان ہے حکومت کوشش کر رہی ہے کہ اسے ترقی دے کر جلد دفتری زبان بنایا جائے اس لیے اردو ٹائپ اور اردو مختصر نویسی جاننے کی اشد ضرورت ہے یوتھ موومنٹ نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ کلاس جاری کی ہے۔

(قومی آواز لکھنؤ)

"ہماری زبان"
سے خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(بقیہ صفحہ ۴ کا)

اٹھاتا کون رشک دوستی غیر کے صدمے — اسی میں خیر ہے اے بندہ پرور دغا تم ہو
دیکھو آئینہ نہ دیکھو خود نمائی کے لیے — آئینہ بن جاؤ تم خود ہی، کہیں ایسا نہ ہو
خدا لائے وہ دن یہ نقشہ دل ستم گر ہو — کہیں آئینہ وہ تصویر گر تصویر کا گھر ہو
ابھی ٹلتا ہوں میں ذرا ابھی تم راہ پر آؤ — نہیں وعدہ تمہارا ہوں تم میرا مقدر ہو

۷۔ نظمیں

درباروں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے آپ نے مدحیہ قصائد بھی لکھے۔ نظام دکن میر عثمان علی خاں کی مدح میں ایک طویل مسدس لکھی ہے جو کئی ایک بند پر مشتمل ہے۔ یہ مسدس معاصری چشمک کی بدولت ممدوح تک رسائی نہ پا سکا۔ اس کے یہ بند دیکھیے آغاز کس قدر شاندار ہے۔

پھولا جو گل عقدہ کشائے سحر عید — خوشبو سے بسی آپ ہوائے سحر عید
دل کش نہ ہو کیوں نشو و نمائے سحر عید — وہ نور کا تڑکا وہ فضائے سحر عید
ہر سمت کھلا تختۂ جنت نظر آیا
آنکھیں جو کھلیں جلوۂ قدرت نظر آیا

صف بستہ اقامت سے تھے بجائے ہوئے اشجار — خم ہو کے رکوع ان کی تھی ہر شاخ ثمردار
سجدے کو گرے پڑتے تھے پختہ تھے جو اثمار — لب پر تھی شگوفوں کے تشہد کی یہ تکرار
کثرت میں بھی جلوہ تری قدرت کا دیا ہے
ہر رنگ میں جلوہ تری صورت کا دیا ہے

یہ ان قصائد کے علاوہ ہے جو دیگر روسا کی مدح میں لکھے گئے۔

ان کے علاوہ کئی ایک نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں ان کے موقلم نے منظر کشی کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رہوار طبیعت ہر میدان میں جولانیاں دکھانے پر ہر وقت آمادہ رہتا تھا۔ ان کی ایک نظم کے چند شعر دیکھیے۔

تصویر یاس

تجھ کو اے جلوۂ بیرنگی دنیا دیکھوں — یا ترے دیکھنے والوں کا تماشا دیکھوں
روئے آغاز نشاط طرب افزا دیکھوں — سر انجام غم حوصلہ فرسا دیکھوں
کیوں نہ بستی کا گماں ہو مجھے ویرانہ پر
نقش میخانہ ہے، ٹوٹے ہوئے پیمانہ پر

طرز نقشہ ہو جہاں گزران کا نقشہ — شکل رہتی ہو کہیں کی نہ مکاں کا نقشہ
دیدۂ غور سے دیکھو جو یہاں کا نقشہ — برگ گل پر نظر آجائے خزاں کا نقشہ
بستیاں بنتی ہیں بے شبہ اجڑنے کے لیے
شکل جو بنتی ہے، بنتی ہے بگڑنے کیلیے

اردو کے علاوہ آپ کو فارسی زبان پر بھی خاصہ عبور اور قدرت حاصل تھی۔ اس میں غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں۔ اور اپنے فضل و کمال کا اپنے ہم عصروں سے لوہا منوا لیا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار سے قدرت کلام کا اندازہ کیجیے۔

غزل

زقید ہستی در گلستان ہر دل شادم — مثال سرو پابندم مگر مشہور آزادم
بہ تعمیر مکاں مصروف ہستم گرچہ میدانم — حباب آساست در بحر جہاں بر آب بنیادم
ہزاراں آفریں بر بازوئے قاتل کہ در یکدم — زخطرات شب تار فراقش کرد آزادم
شدہ از غفلت خود سرنگوں کز دیدۂ مردم — برنگ قطرۂ اشک چکیدہ حیف افتادم
مزار ما معلق گشت بر اوج فلک قائم
صبا رفت دہد برگ گلے چند اگر بربادم

بحیثیت مجموعی آپ کا کلام ان سب خوبیوں کا حامل ہے جو ہم عصر اساتذہ میں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ کا حلقہ کافی وسیع ہے اور جن کا ذکر مختلف متداولہ تذکروں میں ملتا ہے ان میں کئی ایک صاحب دیوان بھی ہوئے ہیں۔

لیکن خود ان کا کلام ابھی تک شایع نہیں ہوا، اگرچہ ان کے پوتے محمد مشتاق علی مشتاق نے مرتب کر رکھا ہے لیکن عدم استطاعت اشاعت کی راہ میں حائل ہے۔

میونسپل کچرل کمیٹی ساگر کا مشاعرہ

ساگر نگر پالیکا کی کچرل کمیٹی کی جانب سے نہرو ہفتہ کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ۱۷ نومبر ۱۹۶۲ء کو منعقد ہوا۔ ساگر نگر پالیکا کی سو سالہ تاریخ میں یہ پہلا مشاعرہ ہے جو انجمن ترقی اردو ساگر کی کوششوں اور تعاون سے نہایت کامیاب رہا بلا مبالغہ دس ہزار سے زائد سامعین نہایت دلچسپی سے صبح تین بجے تک مشاعرہ سنتے رہے۔ جناب جے کشن چودھری حبیب نے اس مشاعرہ کی صدارت فرمائی۔ اختر سعید بھوپالی، روحی دہلوی، تاباں کانپوری، سلطان حمید حیدری، ارشد صدیقی، وفا صدیقی، محمد حسین خاں قہر، حامد پریمی، حکیم عابد اور رام گلی مسرا کو بہت پسند کیا گیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ بیرونی شعراء نے سوا کرائے کے کسی قسم کا معاوضہ انجمن کی خاطر نہیں لیا۔ (محمد یوسف کھتری)

مرکز ادب آسنسول کی نشست

۲۳ نومبر ۱۹۶۲ء کی شام کو مرکز ادب آسنسول کی ادبی نشست زیر صدارت جناب نذیر احمد یوسفی منعقد ہوئی۔

اردو کی ترقی و بقا کے لیے چند طریقے سوچے گئے اور پھر اس سلسلے میں کچھ بحث و تمحیص کے بعد افسانہ نگار حضرات نے اپنے افسانے سنائے اور شاعر حضرات نے اپنی شعری تخلیقات سے نوازا۔ پھر تنقید و تبصرے کا سلسلہ رہا۔ نشست کی کارروائی تقریباً دس بجے شب میں اختتام پذیر ہوئی۔

اس نشست میں جناب نذیر احمد یوسفی، اسلم دربھنگوی، رہبر قادری، انور خورشید، اظہر سہسرامی اور شاہد صدیقی صاحبان نے شرکت کی۔

(وحید آرزو، جوائنٹ سکریٹری)

مراسلات

دُرُشت کلامی

ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ Robust Language کا ترجمہ کیا ہو سکتا ہے۔ بعد میں مختلف اصحاب نے اس کا ترجمہ بد کلامی، سخت کلامی، طراری، طرار زبانی تجویز کیا، اور آپ نے منگرے الفاظ یا منگری زبان کو بہتر بتایا ہے مگر مفہوم کے اعتبار سے Robust Language کا ترجمہ "درشت کلامی" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ (سراج الحسن سراج ادیبی)

حقیقت حال

"ہماری زبان" کے کانفرنس نمبر صفحہ ۳۱ پر جو الفاظ مجھ سے منسوب کیے گئے ہیں وہ قطعی بے بنیاد ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اسٹاف رپورٹر نے تقریر کسی اور کی لکھی اور نام میرا دے دیا میں نے بہار راشٹر میں اردو کی تسلی بخش صورت حال کا ذکر کیا تھا نہ کہ شکایت کی تھی۔

براہ کرم اس خط کو شایع فرمادیں تاکہ کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ رہ جائے۔ (سید شہاب الدین دسنوی)

السوپ اس۔ فیبلس

اقبال کرشن صاحب۔ نے ٹھیک لکھا ہے۔ کہ اس کتاب میں ایسوپ۔ کے پورے ایک سو قصے ہیں لیکن صفحات ۱۲۲ ہیں جسے رام نرائن لال نے الہ آباد سے شایع کیا تھا تاکہ ان لوگوں کو فائدہ ہو جو اردو کی مدد سے انگریزی اور انگریزی کے ذریعہ سے اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ رمضان علی شاہ نے نیشنل پریس الہ آباد میں اسے چھاپا تھا۔ سرورق باتصویر ہے۔ کتاب پر تاریخ طباعت نہیں۔
(سلیم تمنائی)

جواب استفسار

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یہ شعر جناب عندلیب شادانی کا ہے۔

مشکلات غالب

نومبر کے دوسرے شمارے میں "نونیاز" صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ غالب کے شعر کا جو مفہوم علامہ نیاز فتح پوری نے پیش کیا ہے، وہ واقعی غلط ہے۔ غالب کے اس شعر میں محبوب کو ملنے یا برملا ملنے کی تاکید تو ہے ہی نہیں۔

بات یوں ہے کہ جب شاعر اپنے محبوب کے سامنے جاتا ہو یا اچانک کہیں ملاقات ہو جاتی ہے، سامنا ہو جاتا ہے تو محبوب جھٹ منھ چھپا لیتا ہے، پردہ کر لیتا ہے، آڑ میں ہو جاتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں دیکھنے والوں کو محبت کا پتہ نہ چل جائے اس لیے شاعر اپنے محبوب کو مشورہ دیتا ہے کہ ایسے موقعوں پر "منھ چھپانے" کی بجائے "بیگانگی" برتنا چاہیے تاکہ محبوب کا یہ مقصد کہ راز محبت فاش نہ ہو جائے، پورا ہو۔

یہاں شاعر نے بڑی خوب صورتی سے، منطقی استدلال کے ذریعہ، محبوب کی "روپوشی" کی عادت ترک کروانے کی کوشش کی ہے۔ (بے نیاز)

نواب حسین علی خاں اثر

اس عنوان سے میرا جو مضمون ۱۵ر نومبر کے "ہماری زبان" میں شایع ہوا ہے اس میں، تاریخ خلع شدن حسین علی خاں بہادر کے ذیل میں جو قطعہ ہے اس کی تاریخ دیوان ناسخ مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۸۹۳ء میں ۱۲۲۲ھ لکھی ہے حالانکہ خلعت سعید سے ۱۲۲۳ھ سال خلعت معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بہت پہلے نواب سعادت علی خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی تصحیح کر لی جائے۔
(محمد انصار اللہ نظر)

التماس

"نذرانۂ بہار" کے نام سے میں، اردو میں انجہانی پنڈت نہرو پر کہی گئی تمام منتخب نظموں کا ایک حسین و ضخیم مجموعہ شائع کرنے جا رہا ہوں۔ اردو کے ایسے تمام شعراء، جنھوں نے نہرو جی کے حادثۂ انتقال پر نظمیں کہی ہوں، میں بطور خاص گزارش کرتا ہوں کہ اپنے مختصر حالات زندگی کے ساتھ اپنی اپنی نظمیں مندرجہ ذیل پتہ پر زیادہ سے زیادہ ۳۱ر دسمبر تک بھیج دیں۔
(وحید شمسی۔ پوسٹ۔ بھبول پور۔ وایا۔ کنڈواچین پور۔ ضلع چمپارن۔)

حیدرآباد کے مزاحیہ شاعر سرور ڈنڈا کا انتقال

حیدرآباد کے ممتاز و مقبول مزاحیہ اردو شاعر مسٹر سرور خاں کا ۱۹ر نومبر کی شام کو حیدرآباد میں ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔

مسٹر سرور خاں دکنی بولی میں مزاحیہ شاعری کرتے تھے اور سرور ڈنڈا کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔

انھوں نے پسماندگان میں ایک بیوہ اور ۲ بچے چھوڑے ہیں۔
(قومی آواز لکھنؤ)

سخاوت مرزا

میری ڈائری کا ایک ورق

۱۵ر اگست ۱۹۵۰ء آج شام کے چار بجے مولانا یافعی صاحب سے ملاقات ہوئی موصوف اپنے کتب خانہ کی فہرست مخطوطات کی ترتیب کی وجہ سے عدیم الفرصت اور متفکر تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ یہاں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں، دوست احباب کچھ ایسے ہیں کہ تضیع اوقات کے سوا کچھ کام نہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے دیوان خانہ سے اٹھ کر گھر میں گئے، میں نے ان کی ایک ڈائری اٹھائی تو اس میں بعض کتابوں کے متعلق نوٹ نظر آئے مثلاً مثنوی ابراہیم نامہ مصنفہ عبدل بیجاپوری، دوسری کتاب، نصرتی کی جنگ عمران، اور یہ لکھا ہوا تھا کہ شاید اس کا امپیریل گزیٹیر جلد ۳ میں ذکر ہے؟ اتنے میں موصوف تشریف لے آئے، میں نے خیال کیا کہ شاید میری اس حرکت پر کچھ چیں بجبیں ہوں، مگر خاموش رہے میں نے ان کی ڈائری کی تعریف کی اور کہا کہ "آپ کی ڈائریاں تو بڑی کام کی ہیں" تو کہنے لگے کہ بھائی میں نے ایسی بیسیوں ڈائریاں مرتب کی تھیں۔ تاکہ بوقت مضمون نگاری فوراً حوالے مل جائیں مگر یہ کچھ ناتمام ہی رہیں۔ میں نے ان کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو فرمایا کہ معلوم نہیں کہ اس ذخیرۂ کتب میں کہاں پڑ گئی ہیں۔ اس کے بعد کہا افسوس ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کا مجموعہ مضامین الموسوم بہ مقالات شروانی ۱۹۲۶ء میں چھپا ہے۔ مگر بہت سے مضامین متروک ہیں جن کا نوٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں نے صاحب موصوف کے نام ایک خط لکھ رکھا تھا کہ بھیج دوں گا مگر افسوس کہ صاحب موصوف اللہ کے پیارے ہو گئے، اور بھیجنے کی نوبت نہیں آئی۔ شاید شروانی مرحوم کے ذہن میں یہ مضامین محفوظ نہیں رہے۔ مرحوم مجھے جانتے ضرور تھے۔ اور ایک مرتبہ ملنے کی خواہش بھی کی تھی مگر چونکہ وہ بڑے عہدیدار تھے اس لیے میں نے جانا پسند نہیں کیا۔ البتہ میں نے اپنے ایک دوست محمد علی امین کرم دستگیری (رچلی) کے فرزند کو جو علیگڑھ میں زیر تعلیم تھا ایک خط بے تکلفی کا لکھا تھا اور اس طرح مخاطبت کی تھی "چاند میاں" "پیارے چاند" وغیرہ اس کی ملاقات شروانی صاحب سے تھی۔ میرا یہ خط ان کو دکھلا دیا۔ اس کی طرز عبارت دیکھ کر خوش ہوئے اور یہ خط اس کو واپس نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ شروانی صاحب کا کتب خانہ بھی بہت نادر الوجود ہے تو فرمایا کہ ہاں دولت بھی ہے اور ذوق علمی بھی، ہمارے یہاں کے نواب عیش و عشرت میں مبتلا ہیں۔ ان کو کوئی احساس نہیں۔ نواب ظہیر یار جنگ خاندان شمس الامرا کا کتب خانہ اچھا ہے جو ایک بیش بہا ذخیرہ ہے، مگر ان کو کیا خبر ہے کہ اس میں کیا کیا نادر الوجود کتابیں ہیں، پلٹ کے دیکھتے بھی نہیں۔ رسالہ اردو جولائی سنہ ۱۹۳۵ء آیا ہوا تھا جو میری نظر سے گذرا، اس میں کوئی خاص مضمون نہیں تھا۔ اس کے بعد یافعی صاحب نے کہا کہ میں باہر بیٹھتا ہوں آپ یہیں بیٹھے رہیے مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تنہا کیوں بیٹھوں، اس خیال سے کہ ان کی کتابوں کو ہاتھ لگائے کون؟ کوئی کاغذ یا کتاب الٹ پلٹ ہو جائے تو بیچارہ ڈھونڈھتا ہی بیٹھا رہے۔ خیر میں نے کچھ دیر بعد باہر جا کر یہ دیکھا ہمارا دوست (عرب) ایک لنگی باندھے ہوئے پتھر پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں بھی نیچے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور علمی باتیں ہونے لگیں۔ مگر یہ کچھ عجیب نازک مزاج واقع ہوئے تھے کچھ سوال کیا جائے، تو ذرا کڑا ہی جواب ملتا ہے خیر میں نے پوچھا کہ بکٹ وہ بیہم کہانی کیا آپ کے پلنگ کے نیچے رکھی ہوئی ہے تو فرمایا کہ معلوم نہیں میں نے کہاں رکھ دی اور یہ کہا کہ اس کے کئی نسخے ہیں؟ ایک دکنی ترجمہ بھی ہے اور کئی شرحیں بھی مگر مصنف کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے مصنف برہانپور کے شاہ دوست محمد بیان کہے جاتے ہیں تو کہا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے بھی ایک مرتبہ مجھ سے دریافت فرمایا تھا۔ اس کا ایک نوٹ مولوی صاحب کو بھیج دوں گا۔ پھر دیوان سالک کا ذکر آیا، یعنی غوث شاہ سالکؔ کا کلام تو فرمایا کہ میں نے باز خاں نامی کتب فروش سے پوچھا تھا تو اس نے آٹھ روپیہ قیمت بتلائی، جو بہت زیادہ تھی وہ بڑا گراں فروش ہے۔ میں نے کہا کہ دیوان معمولی ہے اور کسی مشہور شاعر کا کلام نہیں تو کہا کہ یہ ایک بزرگ کا کلام ہے جس کی لوگ بہت تلاش میں رہتے ہیں۔ تم نقل کرواؤ گے تو پندرہ بیس روپیہ خرچ ہو جائیں گے۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ انہی بزرگ کی دو اور کتابیں ایک مطبوعہ اور دوسری قلمی، دو ایک روز ہوئے کہ میری نظر سے گزری تھیں، اور میں نے ان کو غور طلب کتابوں میں الگ رکھ چھوڑی ہیں مگر اس وقت کچھ ... نہ بتلا سکے۔ اب اس شخص سے کہے کون کہ بھیا ذرا ہمیں بھی دکھلا دو اور ان کا یہ جواب خشک کون سنے کہ اتنا وقت کہاں؟ پھر میں نے دیوان شہوار فرزند ملک محمود جو تیر کرنولی کے متعلق پوچھا اس خیال سے کہ شاید انھوں نے اس پر کوئی نوٹ لکھا ہوگا میرا مضمون ملک محمود جو تیر پر جو شائع ہو چکا تھا، وہ مجھ سے اس سے قبل حاصل کر چکے تھے کہا کہ بھئی مرزا صاحب، میں نے شاہ نصیر کے دیوان کے ساتھ کہیں رکھ دیا ہے۔ فرصت سے دیکھ لوں گا۔ شہوار کا یہ ایک ضخیم دیوان ہے جو یافعی صاحب کے پاس تھا شہوار غالباً فیض کے شاگرد تھے۔ نصیر الدین نقش نے ان کا ذکر اپنے تذکرہ شعرا "عروس الاذکار" میں کیا ہے۔ ادارہ ادبیات میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے مگر ڈاکٹر زور صاحب کو ان کے حالات کا پتہ نہ چل سکا شہوار کا ذکر تاریخ النوایط مولفہ عزیز جنگ میں موجود ہے اور صولت جنگ تلمیذ داغ نے بھی اپنے دیوان میں ان کا ذکر کیا ہے۔ غرض یافعی صاحب کے مخطوطہ تذکرہ عروس الاذکار سے شہوار کا ایک شعر میں نے نقل کیا تھا جس کا

ایک مصرعہ یہ تھا ؎ "دیدۂ تر کے پھوٹ گئے پر دل سے بولا رو میں گیا" مگر معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ بعد میں شہوار نے اپنے دیوان پر کسی وحشی تخلص شاعر سے (غالباً مخلص رب وحشی جالسنی وارد حیدرآباد معاصر غلام امام شہید سے نظرثانی کرائی تھی چنانچہ یافعی صاحب کے نسخہ میں استاد کی اصلاحیں بھی موجود تھیں، غرض یہ دیوان یافعی صاحب کے زیر غور تھا۔ مندرجہ بالا پورا شعر تو مجھے یاد نہیں رہا البتہ اصلاح شدہ مصرعہ یہ تھا: "دیدۂ تر کے پھوٹ گئے پر دل کے بولا رو میں گیا" کی اصلاح یہ دی تھی۔ "آنکھ کے ساغر پھوٹ گئے پر دل نے بولا رو دیں گیا"۔

بہرحال دیوان نادر تھا۔ یافعی صاحب تقاضہ کرنے سے ذرا چیں بجبیں ہو جاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کو اہل علم بہت ستاتے ہیں۔ اور ایسے بھی جن کو زیادہ تر ذوق نہیں۔ غرض یہ بہت صاف دل اور پرخلوص انسان ہیں۔ باوجود عرب نژاد ہونے کے دکنی اور اردو ادب سے خاص دلچسپی بلکہ عشق ہے۔ اتنے میں ان کے استاد بھائی۔ جناب راغب صاحب، تلمیذ کیفی مرحوم آگئے اور وہ بھی بے تکلفی سے وہیں بیٹھ گئے۔ اور اشارتاً یافعی صاحب سے پوچھا کہ بھائی آخر وہ ذخیرہ کہاں گیا؛ میں خالی الذہن تھا خاموش بیٹھا رہا۔ آخر یہ گل کھلا کہ مولانا رحمی الدین کیفی چونکہ یافعی کے بھی استاد تھے اور وہ اپنے استاد مرحوم کا حق ادا کرنا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے ان سے کئی دیوان فراہم کر لیے تھے اور بہت سا مواد بھی جمع کر لیا تھا۔ تاکہ کچھ استاد کے متعلق لکھ ڈالیں نیز کیفی مرحوم کے فرزند سے بذریعہ رجسٹری طلب خطوط کچھ استفسارات بھی کیے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ یافعی صاحب کو اس سلسلہ میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور کیفی مرحوم کے صاحبزادہ صاحب ایک دن تشریف لائے کچھ باہمی حجت و بحث رہی بعض احباب موجود تھے۔ یافعی صاحب نے رجسٹری کے پرچے بھی حاضرین کے روبرو پیش کیے۔ مگر ان کے صاحبزادہ صاحب پس و پیش کرتے رہے یافعی صاحب نے طوعاً و کرہاً سب ذخیرہ کلام ان کے صاحبزادہ کے حوالہ کر دیا۔ البتہ یافعی صاحب صرف ایک حصہ کلام الموسوم بہ "سرمست" کے نام سے بڑی محنت سے شائع کر چکے تھے جس میں سنہ وار غزلیں موجود تھیں۔ مولانا رحمی الدین کیفی کا ایک مجموعہ مختصر ادارہ ادبیات نے "کیف سخن" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یافعی صاحب نے فرمایا کیفی صاحب آخر میں داغ دہلوی کے بھی شاگرد ہو گئے تھے۔ اور داغ کی استادی کے قائل تھے بڑے بڑے ذی علم لوگ کیفی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ میرے پاس (یافعی) ان لوگوں کے خطوط اور اصلاحیں موجود تھیں۔ چنانچہ محمد احمد خانی (پدر عبدالقیوم خان باقی ایم۔ اے) ایک پختہ کلام اور معمر شاعر تھے۔ مگر کیفی کو اپنا کلام دکھلایا کرتے تھے نیز ایک اور شاعر روشن تخلص نیز اور بھی نام بتلائے تھے جو مجھے یاد نہیں رہے یافعی صاحب نے کہا کہ کیفی نے ایک مرثیہ کہا تھا جس کے کوئی چار سو بند تھے۔ کیفی مرحوم نے اس میں ضمناً یہ بیان کیا تھا کہ انھوں نے نو سال کی عمر سے شاعری شروع کی اور غالباً سترہ سال کی عمر میں اپنا پہلا دیوان مرتب کر لیا تھا، اور اپنے ہر دس سال کے کلام کے مجموعے علحدہ علحدہ ترتیب دیے تھے، پہلا مجموعہ "سرمست" سے موسوم کیا تھا اور دوسرے دس سالہ کلام کے مجموعہ کا نام "سرخوش" رکھا تھا وغیرہ۔ آخری عمر کے دیوان کا نام بھی کچھ رکھا تھا۔ غرض یافعی صاحب کو اس کا بڑا افسوس تھا۔ ہاں، ملفوظات نقشبندیہ شاہ مسافر اورنگ آبادی کا میں نے ذکر چھیڑا تو کہا کہ میرے ترجمے کے مسودہ کو جو ناقص تھا، اور ترتیب صحیح نہ تھی، جس میں میں نے بعض ترمیمات کی تھیں، وہ مولوی ابو الخیر کنج نشین کے پاس تھا موصوف نے میری بغیر اجازت کے میرے نام سے مجلۂ نظامیہ میں اشاعت بھی کر دی مجھے اس کا بہت ملال ہوا اور میں نے ان کو خط لکھا کہ اس کی آئندہ اشاعت فوراً روک دیں۔ فرمایا کہ شاہ مسافر کے متعلق میں اور بھی مواد فراہم کر رہا تھا چنانچہ مجھ کو کلیانی کے نواب کی ڈیوڑھی (محل) واقع مغلپورہ میں جہاں ایک مرتبہ شاہ مسافر مقیم تھے، کچھ مواد ملا تھا احقر نے بھی یافعی صاحب کو اورنگ آباد گزیٹر سے شاہ صاحب رح کے متعلق مواد دیا تھا۔ چونکہ شام ہو گئی تھی، وہاں سے رخصت ہو کر میں اپنے مکان واپس ہوا۔ راستہ میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا افضل گنج کے چمن کے پاس سمادھی اور گوردوارہ سکھان میں جلوس کا انتظام ہو رہا تھا، سلطان بازار (رزیڈنسی) عام گنج میں تقریریں ہو رہی تھیں مجھے تعجب تھا کہ ہمارے ہم وطن جو اردو کی مخالفت کرتے ہیں وہی اردو میں فصیح و بلیغ تقریر کر رہے تھے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی، نے مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ میں چھپایا، اور پبلشر مدیر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے شائع کیا